خواتین افسانہ نگار اور سماجی شعور کی عکاسی

Representation of Social Consciousness in Female Short Story Writers

ڈاکٹر عظمت رباب
ڈاکٹر صائمہ ارم

Abstract

Urdu Fiction, including novels and short stories, is flourishing for more than a century now. Many writers participated significantly in the development of Urdu Fiction, in various ways. Women writers are no less skilled than their male counterparts. Since the beginning, female writers are understanding and narrating grieve social problems surrounding them. Not just as women but also as persons. This article deals with the contributions of female writers in Urdu Fiction.

Key Words: Urdu Fiction, Female Writers, Social Consciousness

اردو افسانے کے آغاز و ارتقا میں خواتین ادیبوں اور افسانہ نگاروں کا حصہ بہت اہم اور نمایاں ہے۔ ادب کے ابتدائی دور ہی سے اردو ادب کی تاریخ میں نسائی جہت داخل ہو گئی۔ خاص طور پر شاعری میں تو شاعرات کی ایک کہکشاں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اردو افسانے کی تاریخ کا جائزہ بھی یہ بتاتا ہے کہ اردو افسانے کے ابتدائی دور ہی سے خاتون افسانہ نگاروں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے اردو افسانے کے ارتقائی مراحل میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ اور امر ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر ان افسانہ نگاروں کی خدمات کو بالعموم نظر انداز کیا گیا یا ان کے بارے میں سرپرستانہ یا مشفقانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود کئی ایک باہمت خواتین نے اپنے تجربے، مشاہدے، قدرت بیان، تازگی اور ندرت کی بنا پر اپنے آپ کو منوالیا اور تاریخ ادب میں اپنا نام ہمیشہ کے لئے تحریر کرالیا۔

اردو افسانے اور ناول کے ابتدائی دور میں اپنی حیثیت منوانے کی جدوجہد میں پیش پیش خواتین میں سے کچھ نمایاں نام مندرجہ ذیل ہیں۔ ملکہ سلطان بیگم، بیگم فرماں روائے بھوپال، محمدی بیگم، عطیہ فیضی، نذر سجاد حیدر، نفیس دلہن، صغریٰ ہمایوں مرزا، موتی بیگم، فاطمہ زہرا بیگم، فاطمہ بیگم، خجستہ اختر، زہرا بیگم، عباسی بیگم، حامدہ بیگم الخیری، خدیجۃ الکبریٰ، امت الکریم، مہدی بیگم، وحیدہ بیگم اور بیگم شاہنواز و دیگر۔ مولوی ممتاز علی کی بیوی محمدی بیگم نے اپنے شوہر کے کہنے پر ''تہذیب نسواں'' کی ادارت سنبھالی اور اسے کامیابی سے چلایا۔ یہ رسالہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ صغریٰ ہمایوں مرزا ناول لکھتی تھیں اور ''النساء'' (حیدر آباد) اور ''زیب النساء'' (لاہور) کی ایڈیٹر بھی رہی

ہیں۔

اسی دور میں خواتین کی تعلیم وتہذیب کے لئے کئی رسائل جاری ہوئے جنہوں نے نہ صرف خواتین کی تربیت کی بلکہ انہیں لکھنے کے مواقع بھی فراہم کئے۔

> ''اب سے نصف صدی قبل دلی سے مولوی سید احمد مؤلف ''فرہنگ آصفیہ'' نے ''اخبار النساء'' جاری کیا۔ لاہور سے منشی محبوب عالم نے ''شریف بی بی''، آگرہ سے عزیزی پریس والوں نے ''پردہ نشین'' اور علی گڑھ سے شیخ عبداللہ نے ''خاتون'' مگر یہ رسالے زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے البتہ مولوی ممتاز علی کے ''تہذیب نسواں'' اور علامہ راشد الخیری کے ''عصمت'' نے استقلال کے ساتھ اپنی خدمات جاری رکھیں۔ اردو میں آج تک قابل ذکر لکھنے والیاں پیدا ہوئی ہیں ان میں اکثر و بیشتر ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' ہی کے ذریعے متعارف ہوئی ہیں۔''(۱)

خاص طور پر رومانوی تحریک کے دور میں لکھنے والی خاتون افسانہ نگاروں میں حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقادر کے نام نمایاں ہیں۔

حجاب امتیاز علی اردو افسانے میں انسانی رویوں اور رسومات کی عکاس افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت کے سائے جھلکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر ''صنوبر کے سائے'' ایسے معاشرے میں جہاں سیاسی اور معاشی استحصال تھا ایک اجنبی دنیا کی کہانی پیش کرتی ہے لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حجاب امتیاز علی نے تخیل کے پردوں سے حقیقت کی برہنگی کو ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی تحریروں میں مبتدیانہ یا تبلیغی رنگ نہیں ملتا۔ احساس کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی امتیاز علی کا رشتہ ارضی حقائق سے جڑا رہتا ہے۔ ان کے کرداروں میں پڑھی لکھی، ذہین اور باشعور لڑکیوں کے کردار بھی شامل ہیں۔ جن کے رومانوی طرزِ احساس میں اداسی کا عنصر بطور خاص شامل ہے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ ''پے انگ گیسٹ'' بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ہوا تو اس تحریک کے اوّلین علمبرداروں میں ڈاکٹر رشید جہاں کا نام نمایاں ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں وہ خاتون ہیں جنہوں نے فیض احمد فیض کو ''دلے بفروختم وجانے خریدم'' پر آمادہ کیا۔ اس سلسلے میں فیض رقم طراز ہیں:

> ''سیاست میں تو ہم نے فوج میں جانے سے پہلے ہی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب ہم ۱۹۳۵ء میں امرتسر میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ایک ہمارے رفیق کار تھے۔......صاحب زادہ محمود الظفر، ان کی بیگم تھی ڈاکٹر رشیدہ جہاں۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم ہندوستان میں ہی قائم کی جائے۔ کیا تمہیں اس میں دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا زمانہ تھا اور عاشقی وغیرہ کا مرض بھی لاحق تھا۔ بیگم رشیدہ

> جہاں نے کہا چھوڑو یہ عاشقی وغیرہ کا چکر۔ سب فضول بات ہے۔ دنیا کے دکھ جو ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمہاری عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے اور انہوں نے ہم کو سکھایا کہ اپنا غم جو ہے یہ تو بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو اور اپنے لیے سوچتے رہو گے تو یہ خود غرضی کا عمل ہوگا۔ چنانچہ یہ شعر ہمارے اس زمانے کی یادگار ہے:
>
> اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا (۲)

انگارے گروپ کے مصنفین میں ڈاکٹر رشید جہاں کا نام نمایاں ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کو نوجوانوں کے اس گروہ میں کلیدی حیثیت حاصل تھی جس نے روایت پر کاری ضرب لگائی اور اپنے ذہنوں کو کشادگی کی طرف مائل کیا۔ انگارے میں چھپنے والا افسانہ ''دلی کی سیر'' دہلی اسٹیشن کی گہما گہمی اور اولین شہری زندگی کی جھلک لئے ہوئے ہے۔ رشید جہاں کا ایک اور افسانہ ''نئی مصیبتیں'' دوسری جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے اثرات کا عکاس ہے۔ اس افسانے میں رشید جہاں کا موقف یہ ہے کہ جنگِ عظیم سے امرا اور طرح متاثر ہوئے جب کہ غریبوں پر اس جنگ کے اثرات چنداں مختلف تھے۔ ان کا افسانہ ''سودا'' سماجی حقیقت نگاری کی انتہاؤں کو چھوتا ہوا ایک سفاک افسانہ ہے۔ اس افسانے میں جسم کی خرید و فروخت اور گروپ سیکس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور اس میں اسفل السافلین کی حد تک گرے ہوئے انسانوں کی گھٹیا سوچ اور عمل کا سفاک بیان ہے جو عورت کو اس طرح مل کر جھنجھوڑتے ہیں جیسے کئی کتے مل کر اپنے قابو میں آ جانے والی ہڈی پر دانت اور ناخن تیز کرتے ہیں۔ ان کے ایک اور افسانے ''غریبوں کا بھگوان'' میں پریم چند کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ افسانہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں غریب عورت کے استحصال کی داستان بیان کرتا ہے۔ ''میرا ایک سفر'' میں تکنیک کے لحاظ سے ایک خط کے ذریعے ہندو مسلم فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی موضوع پر ان کا افسانہ ''پن'' بھی بہت اہم ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''پھر ایک جلوس میں ہندو بچے نکلتے ہیں، ہندی تمہیں اب پڑھانا پڑے گی۔ مسلمان بچے جواب دیتے ہیں۔ ہندی ہمیں اب مٹانا پڑے گی۔ کوئی ہندو ان بچوں کو یہ نہیں سکھاتا، تمہیں ظلم و غربت مٹانا پڑے گی۔ یہ دکھ اور مصیبت ہٹانا پڑے گی۔'' (۳)

اسی دور کی مزید خواتین افسانہ نگاروں میں رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے نام نمایاں ہیں۔ اسی طرح واجدہ تبسم نے بھی حیدر آبادی تہذیب پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ (۴) ایک اور اہم نام ممتاز شیریں کا ہے۔ ممتاز شیریں کی بنیادی حیثیت ایک ممتاز نقاد کی ہے لیکن افسانہ نگاری میں بھی ان کی کاوشیں قابل لحاظ ہیں۔ ''معیار'' اور ''منٹو نوری نہ ناری'' جیسی عمدہ تنقیدی کتابیں لکھنے والی اس مصنفہ کے افسانوں پر بھی ان کے علم کا اثر نظر آتا ہے۔ ممتاز شیریں کو ترقی پسند افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے لیکن ان کے افسانوں میں متوازن فضا اور سماجی مسائل کے غیر جانبدارانہ محاکے کا انداز ملتا ہے ان کے افسانے ''رانی'' اور ''شکست'' کی بنیاد خاص طور پر ہندوستان

کی معاشی صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فضا پر استوار ہے۔

> ”وہ گڑگڑا رہی تھی پھر خاموشی سے آنکھیں پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی اور گھر آ کر پانچوں بچوں کو ساتھ لے آئی۔ اف وہ بچے! آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ صرف ایک پھٹی لنگوٹی باندھے ننگ دھڑنگ، پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا اور پسلیوں کی ہڈیاں اتنی ابھر آئیں تھیں کہ انہیں اچھی طرح گنا جا سکتا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے تین دن سے نہیں تو ایک دو دن سے تو کچھ نہیں کھایا تھا، وہ مشکل سے گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے اور چھوٹے بچوں کو تو ماں کھینچے لئے آ رہی تھی۔“(۵)

ممتاز شیریں کا افسانہ ”کفارہ“ خواب اور نیم خوابی کی درمیانی کیفیت میں سے گزرتا ہوا افسانہ ہے۔ افسانے کی نیم تاریک، نیم خوابیدہ فضا میں واحد متکلم کے احساسات کا عمدہ بیان ہے۔ ان کے ایک اور افسانے ”گھر تک“ کی فضا بھی نیم تاریک ہی ہے۔ اس افسانے کی کہانی بغیر کسی مستقل پلاٹ کے آگے بڑھتی ہے۔ لیکن اس افسانے میں بھی ممتاز شیریں نے احساسات کو مجسم کر دیا ہے۔ کافکائی خواب اور عالم بیداری کا یہ انداز ایک دور میں افسانہ نگاروں کا محبوب انداز رہا ہے۔ محمد عمر میمن، اپنے افسانوی مجموعے ”تاریک گلی“ کی ابتداء میں میلان کنڈیرا کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں جو اس انداز کی عمدہ تشریح ہے:

> "Imagination. "What did you mean by the story about Tamina on the children's island " People ask me. That tale began as a dream that fascinated me; I dreamed it later in a Half- waking state…… the dream preceded the meaning." (٦)

ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں اس تکنیک کو بہت عمدگی سے برتا ہے۔ ان کے افسانے ”بھارت ناٹیہ“ میں تقسیم ہندوستان کے اثرات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں کے ضمن میں الطاف فاطمہ کا نام بھی بہت اہم ہے۔ الطاف فاطمہ خواتین افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے علامت پسندی کے دور میں بھی کہانی پن سے ربط برقرار رکھا۔ الطاف فاطمہ نے کئی بہت عمدہ کہانیاں لکھی ہیں اور ان کا فنی سفر ہنوز جاری ہے۔

ادھر جیلانی بانو کا تعلق بھی خاتون افسانہ نگاروں کی اسی نسل سے ہے۔ تقریباً ستر کی دہائی کے آخر میں بطور افسانہ نگار اپنی شہرت مستحکم کرنے والی اس خاتون افسانہ نگار کا سفر اب بھی جاری ہے اور اردو کے موقر ادبی جرائد میں وقتاً فوقتاً ان کے افسانے، پڑھنے والوں کے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔ جیلانی بانو کے افسانوں کی بنیاد ان کی عصری حسیت پر استوار ہے۔ ”ایک شہر بکاؤ ہے“ اور ”راستہ بند ہے“ جیسے افسانے ان کے سماجی شعور کے واضح عکاس ہیں۔ بڑھتے ہوئے جرائم، بے روزگاری کا عفریت، منسٹروں کے رویے، ٹریفک کا شور، لوگوں کی بے صبری،

اینٹوں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے مزدور، الغرض شہری زندگی پوری جزئیات کے ساتھ ان کے افسانوں میں در آئی ہے۔

> اب راستہ کب کھلے گا......؟ ٹریفک کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔ چاروں طرف سڑکوں پر کاروں، اسکوٹر، آٹو رکشا اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم ہے۔ لوگ بے صبری سے راستہ ملنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسکول جانے والے بچے بیگس سنبھالے کھڑے ہیں۔ سر پر اینٹوں کا ٹوکرا اٹھائے مزدور، گھر کا سامان لے جانے والی عورتیں، لاٹھی کے سہارے کھڑے ہوئے بوڑھے لوگ، ممی نو بجے ہمارا امتحان شروع ہو جائے گا۔ ایک بچہ گھبرا کے اپنی بہن سے کہتا ہے۔'' (۷)

چیف منسٹر کی سواری گزرنے کے انتظار میں راستہ بند ہو چکا ہے۔ ادھر موٹروں، کاروں، رکشوں، ویگنوں میں ٹھنسے ہوئے افراد اپنے ضروری کاموں میں تاخیر سے پریشان، اپنے آقا کی سواری کے انتظار میں جبراً رکے ہوئے ہیں۔ وی آئی پی پروٹوکول سے ہراساں، یہ عوامی چہرے تکلیف، دکھ اور اذیت سے مسخ ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی کا امتحان ہے تو کسی کا انٹرویو، کسی کا ٹی وی پروگرام شروع ہونا ہے تو کسی کے کیریئر کا معاملہ اس تاخیر سے کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ کوئی بیمار ہے تو کوئی دردِ زہ میں مبتلا۔

لیکن یہ سب لوگ اس وقت تک اپنی منزل کی طرف نہیں بڑھ سکتے جب تک کہ حاکم وقت راستہ کھول دینے کا حکم نہیں دیتا۔ سیاسی آقاؤں نے راستہ بند کر رکھا ہے۔ تلاش منزل کا راستہ، سچائی، دیانت داری اور امن کا راستہ، معاشی خوشحالی اور سماجی آسائش کا راستہ، ترقی اور علم کی بڑھوتی کا راستہ، انصاف اور قانون کی بالادستی کا راستہ اور ہر ایک اسی سوچ میں ہے کہ یہ راستہ کب کھلے گا۔ جیلانی بانو کی کہانیوں میں عصری مسائل کا خوب صورت بیان ہوا ہے۔ ارتضیٰ کریم اس کہانی پر اپنے تنقیدی تبصرے میں لکھتے ہیں:

> ''(جیلانی بانو) یوں بھی اردو کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ زبان، اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری اور موضوعات کا انتخاب اور ان کی پیش کش فنکارانہ چابکدستی سے کرتی ہیں۔...... جیلانی بانو نے اس کہانی میں رشوت ستانی، چور بازاری، غیر انسانی رویے، سیاسی شعبدہ بازی، اخلاقی زوال پر چھوٹے چھوٹے جملوں کے حوالے سے حساس قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے......ان میں عصری ہندوستان کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ یا چہرہ روشن نظر آتا ہے۔ نیز یہ اپنے اندر جہانِ معانی پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اس افسانہ کا وہ نوجوان کردار جو ''گٹار'' بجاتا ہے اور دراصل ایک ''فنکار'' کی نمائندگی کر رہا ہے ایک معنی خیز کردار ہے......اصلاً وہ اپنے عہد کے منظر نامے سے زیادہ واقف ہے اور اپنے ملک کی سیاست سے باخبر بھی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ہمارے سیاست دان عوام کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں اور ان کی توجہ اصل مسائل سے ہٹاتے رہتے ہیں۔ (۸)

خواتین افسانہ نگاروں میں بانو قدسیہ بھی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ یوں تو ان کا ناول ''راجہ گدھ'' مقبول عام ہے اور فنی و موضوعاتی لحاظ سے بھی اس ناول نے کئی بحثوں کو جنم دیا ہے لیکن اس ناول کی تب وتاب نے بہرحال بانو

قدسیہ کی افسانہ نگاری کی چاندنی کو مدہم نہیں کیا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے مثلاً ’’کچھ اور نہیں‘‘، ’’بازگشت‘‘، ’’توجہ کی طالب‘‘ اور ’’امر بیل‘‘ وغیرہ اور ناول زیور طبع سے آراستہ ہو کر ناقدین اور عام قاری کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں۔

بانو کے افسانے ’’ہو نقش اگر باطل‘‘ میں متوسط طبقے کی ازدواجی زندگیوں کی تلخیوں، نفسیاتی الجھنوں، چھوٹی چھوٹی بے وفائیوں اور سنگلاخ حقیقتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ’’سوغات‘‘ کا تانا بانا بھی گرہستنوں کے درد اور کرب سے بنا گیا ہے۔ لیکن جدید سماجی زندگی کی منافقتوں کا حال افسانے میں بھی نظر آتا ہے۔

> ’’ساری گلی میں صرف گلزار نے پانچ منزلہ مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ فائیو سٹار ہوٹل اندر باہر سے دیکھا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں معمولی لفٹ مین تھا اور کئی سیاسی لیڈر، مشہور فلمی ایکٹریسیں، گول گول پیٹوں والے سرکاری افسر جو لفٹ میں دبی دبی ڈکاریں لیا کرتے تھے اور جو سب کے سب تبخیر معدہ کے مریض تھے، بہت قریب سے دیکھے تھے۔ جب شہر کی معزز، مقتدر اور صاحب اقتدار ہستیاں اس کے ساتھ لفٹ میں بند ہو جاتیں اور وہ اپنی ٹریننگ کے مطابق نظریں صرف بٹن پر رکھتا تو اس کے کان مائیکروفون کی طرح تیز ہو جاتے۔ چھ مہینوں میں اس کی کئی قدروں پر پانی پھر گیا۔ کئی باتیں جو اس کے نزدیک بڑی معیوب تھیں۔ اب قابل تحسین ہو گئیں۔ کئی باتیں جو قابل تحسین تھیں۔ اب مضحکہ خیز نظر آنے لگیں۔ چھ ہی مہینے میں اس کا حال بالکل ایسا ہو گیا جیسے دستانہ اندر سے باہر کر دیا گیا ہو۔‘‘(۹)

بانو کا افسانہ ’’ناخواندہ‘‘ پاکستان کے تعلیمی نظام پر خوبصورت انداز کا طنز ہے:

> ’’آٹوگراف کا چٹھہ میری میز پر اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ کئی مشتاق اس وقت وہ ٹاپک تشکیل دے رہے ہیں جو اگر انہیں مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو مجھ سے کہیں گے۔ سوشلزم، عورتوں کے حقوق، مذاہب کی اہمیت، نظریہ پاکستان کی تردید یا توضیح، کلچر آرٹ کی رنگارنگی، بدلتے ہوئے معاشرے کی الجھنیں، پاکستانی فلموں کی یک رنگی اور پنجابی گیتوں کی گوناگوں صحت مندی، بیرونی ممالک سے آنے والے ابلاغ عام کے وسائل، ...... تھا پٹاخ جیسی امریکن فلموں کا افادی یا مضرت رساں اثر، جنس اور محبت کی حدود اور فاصلے بیرونی ممالک کی تعلیم، اپنے ممالک کی بے روزگاری...... ان گنت چالو ٹاپک۔ جن پر ہر پڑھا لکھا آدمی سوچتا ہے اور اپنی تربیت، تعلیم اور پس منظر کے مطابق ابلتا اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔‘‘(۱۰)

ظاہر نمود و نمائش پر بانو قدسیہ کا افسانہ ’’ہاتھی دانت‘‘ ایک عمدہ تحریر ہے۔ معصوم سیدھی سادی عائشہ اور اس کے پڑوس میں بلی آپا کا گھرانہ جو اپنے گھر کی ہر شے پر نمائش کا ملمع چڑھانے میں بے حد ماہر ہے۔ ’’کاغذی ہے پیرہن‘‘ میں بھی بانو قدسیہ نے جدید شہری معاشرے کی مصنوعیت کو بخوبی اجاگر کیا ہے:

> ’’ابھی اٹھ کر جانے والی کے لئے میرے جذبات میں وہ وارفتگی، بے ساختہ پن اور طہارت نہیں

> ہے۔۔۔۔۔۔لیکن یہ زمانہ طہارت کا زمانہ نہیں۔ یہ کمرشل آرٹ کا زمانہ، مصنوعات کا زمانہ ہے۔“(۱۱)

بانو قدسیہ کا افسانہ ”بیوگی کا داغ“ معاشرے میں عورتوں کے بدلتے ہوئے معیارات پر تحریر کیا گیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن نیلو کو اس کا باپ ڈاکٹری پڑھنے کی اجازت دیتا ہے اور اس اجازت کی وجہ باپ کی روشن خیالی نہیں بلکہ یہ فکر ہے کہ جب وہ کمانے کے لائق نہیں رہے گا تو گھر کون چلائے گا۔ یوں نیلو گھر سے باہر قدم رکھتی ہے آہستہ آہستہ اس کے معمولات بھی تبدیل ہونے لگتے ہیں اور اس کی عادات، لباس و اطوار بھی۔ بانو قدسیہ کا یہ افسانہ بدلتے ہوئے سماج کا ایک نقشہ سا بیان کرتا ہے۔

بانو قدسیہ کے زیادہ تر افسانوں کا تعلق متوسط طبقے کے گھرانوں سے ہے۔ ان گھروں کا گھٹا گھٹا سا ماحول، غیر واضح اور مبہم نفسیاتی مسائل، جنسی الجھنیں، سسکتی ہوئی زندگی، ازدواجی زندگی کی گھاتیں ان سب سے مل کر بانو قدسیہ کے افسانے تشکیل پاتے ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اور اہم نام فہمیدہ ریاض کا ہے۔ فہمیدہ ریاض کا بنیادی حوالہ تو ان کی شاعری ہے لیکن ناول نگاری اور چند ایک افسانوں میں بھی انہوں نے اپنی مہارت کا سکہ جمایا ہے۔ ان کا افسانہ ”دفتر میں ایک دن“ سماجی صورتِ حال کی بہترین منظر کشی کا حامل افسانہ ہے۔ سرکاری دفاتر کا عمومی ماحول، کام چوری، سرخ فیتوں کی نذر ہو جانے والے اہم مسائل کی فائلیں، رشوت ستانی، ذاتی تعلقات یا مذہبی جنونیت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل، ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے کا رویہ، سرکاری افسروں کی بے نیازی اور سرد مہری الغرض جدید شہری زندگی کے بے حس سرکاری اداروں کا پورا ماحول اس ایک افسانے سے بخوبی منعکس ہو جاتا ہے۔

> ”اسے یاد آیا تھا۔ اسلام آباد میں فنانشل ایڈوائزر سے ملنے اس کے ساتھ سندھ مدرسہ کی پرنسپل بھی گئی تھیں۔ دونوں کی درخواست ایک ہی تھی کہ اداروں کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے جو ۱۹۸۶ء سے مرکزی کھاتوں سے غائب ہیں۔ سندھ مدرسے کی پرنسپل لیاری کی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ جنہوں نے زندگی کے پچیس تیس برس اسی مدرسے میں تدریس کرتے ہوئے بتائے تھے لیکن فنانشل ایڈوائزر سے وہ کس طرح بات کر رہی تھیں! جب انہوں نے کہا ”جناب ہم آپ کے بال بچوں کو دعائیں دیں گے اللہ سائیں آپ کا اقبال ہمیشہ بلند رکھے“ تو عورت غم و غصے سے مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنے ادارے کے لئے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ افسوس اور شرمندگی کی طاقتوں نے اس کا دل جکڑ لیا تھا۔ بار بار ایک ہی خیال ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ ”بھکاری بنا کر رکھ دیا ان کو۔“(۱۲)

فہمیدہ ریاض نے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

> ”میرا خیال ہے ہمارا دور شکست و ریخت کا ہے۔ اس میں سے ایک نیا دور ابھرے گا۔ نئے آدرش سامنے آئیں گے۔ اس دور میں ایک اور دور بھی زندہ ہے۔۔۔۔۔۔ اگرچہ ہمارے دور میں بے راہ روی

> بھی ہے، بے سمتی بھی۔ لیکن اس میں ایک نئی سمت کی تلاش بھی ہے۔'' (۱۳)

حال کی بدحالی، مستقبل کی خوش بینی فہمیدہ ریاض کے دیگر افسانوں میں بھی ملتی ہے۔ ان کے افسانے، ان کی گردوپیش کی زندگی کے مظہر ہیں۔ ان کی افسانہ نما تحریر ''فعل متعدی'' بھی سرکاری دفاتر کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔

خالدہ حسین، خاتون افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام ہیں۔ ان کے افسانے کسی قدر علامتی انداز میں عصری پیچیدگیوں کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوی سفر میں عہد کی تاریخ ان کے ساتھ ساتھ چلی ہے۔ ۲۰۰۵ء تک انسانی حقوق کا علمبردار بننے والے مغربی ممالک دہشت گرد کہہ کر انسانوں کے ساتھ کس قدر غیر انسانی سلوک کرتے ہیں اس کی ہولناک تصویر کشی خالدہ حسین کے افسانے ''ابن آدم'' میں نظر آتی ہے۔

اردو کی خاتون افسانہ نگاروں میں فردوس حیدر کا نام بھی اہم ہے۔ ان کا افسانہ ''گائے'' عورت کی جنسی ناآسودگی اور گھٹن کو علامتی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ فردوس حیدر کے علاوہ جدید عہد کی لکھنے والیوں میں طاہرہ اقبال، نیلم احمد بشیر، رضیہ فصیح احمد، نگہت سلیم، رفعت مرتضٰی وغیرہ کے نام ایسے ہیں جن میں کامیابی کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں البتہ ان کے فن کو نکھرنے اور منجھنے میں ابھی وقت لگے گا۔

جدید دور کے لکھنے والیوں میں طاہرہ اقبال کا نام بھی خاصا اہم ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے اور دو ناولٹ اور ایک ناول منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''گنجی بار'' سب سے اہم ہے۔ ان کے افسانوں کا پس منظر زیادہ تر وسطی پنجاب کا جاگیردارانہ نظام ہے۔ جس کی وہ کامیاب عکاس ہیں۔ شہری مسائل کی طرف ابھی تک ان کی خاطر خواہ توجہ نہیں ہے۔

جدید اردو افسانے کی ایک نسبتاً تازہ اور نہایت توانا آواز ذکیہ مشہدی کی ہے۔ حال ہی میں ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''پارسا بی بی کا بگھار'' پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ (۱۴) ان افسانوں کے معیار کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ذکیہ مشہدی مستقبل قریب کی ایک نہایت اہم خاتون افسانہ نگار ثابت ہوں گی۔

ذکیہ مشہدی کا افسانہ ''ماں'' گنگا وئیرا کے علاقے میں تنہا زندگی گزارتی ایک عورت کا قصہ ہے۔ اس افسانے کی منظر کشی اور جزئیات نگاری میں فنی مہارت اور چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ غریب عورت ''منی'' جو مالک کو ان داتا سمجھتی ہے اور اپنی بساط بھر عقل میں صدیوں کی غلامی لئے یہ مانتی ہے کہ مالک کو خوش رکھنا ہی اس کا ازلی فریضہ ہے۔ محبت کا اور فرض کا گھلا ملا احساس لئے یہ ایک اچھوتی کہانی ہے۔ ذکیہ مشہدی کا دوسرا افسانہ ''ہدو کا ہاتھی'' بھی عمدہ تحریر ہے۔ یہ افسانہ درمیانے طبقے کے نیم خواندہ ملا کی زندگی پر لکھا گیا ہے جس کا رزق دوسروں کے گھروں سے حصے کی صورت میں آتا ہے:

> ''......شب برات کے شب برات فاتحہ خوانی کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔ اور فاتحہ خوانی بھی اب

> کہاں۔ جب سے تبلیغی جماعت والوں کا زور بڑھا ہے، محلے میں فاتحہ کرانے والے گھر بھی بس دو چار ہی رہ گئے ہیں۔ نہ جلسے جلوس......۔’’(۱۵)

ذکیہ مشہدی نے اس افسانے میں تاریخ اور عصری حسیت کا خوبصورت امتزاج پیش کیا ہے۔ ہدو، جس کے شجرے میں چھ سو ہاتھیوں کے مہتمم اعلیٰ سید سنجر حسین کا نام درج ہے۔ گردشِ دوراں سے بے حال ہو کر بالآخر رکشہ چلانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خاندانوں کے عروج و زوال کی یہ عمدہ داستان ہے۔ ‘‘فضلو بابا ٹخ ٹخ’’ جانے پہچانے ماحول میں آہستگی سے اپنا راستہ بناتی ہوئی خوبصورت کہانی ہے۔ فضلو بابا کی زندگی کی کہانی جو غربت کی چکی میں پستے تھے لیکن خوبصورت اور مضبوط روایات کے امین تھے اور ایک دن لسانی فسادات کی بھیانک نفرت کی زد میں آ کر مارے گئے تھے۔ ‘‘تھوڑا سا کاغذ’’ ذکیہ مشہدی کا ایک اور خوبصورت افسانہ ہے۔

اردو افسانے کا ایک اور معتبر نام فرخندہ لودھی کا ہے۔ انتظار حسین فرخندہ لودھی کی کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ‘‘قیام پاکستان کے فوراً بعد کے زمانے میں جب ہر لکھنے والا اس موضوع پر لکھ رہا تھا۔ لکھنے والوں نے جو کہانیاں لکھیں۔ وہ زیادہ تر لوگوں کے اپنی بستیوں سے اجڑنے اور قتل و خون کے مرحلہ سے گزرنے کی کہانی سناتی ہیں......فرخندہ لودھی نے اپنی مختلف کہانیوں میں اس کہانی کو اس سے آگے چلایا ہے اور دکھایا ہے کہ پھر کیا ہوتا ہے......اس لمبے دنوں کی کہانیاں بھی ہیں جو پاکستان کے ماہ و سال میں لمبے کھنچے چلے جاتے ہیں اور ایک عبرت کا درس دیتے ہیں۔’’(۱۶)

فرخندہ لودھی کی افسانہ نگاری تو ۱۹۴۷ء کے بہت بعد شروع ہوئی لیکن وہ معاشرے کے ایک حساس فرد کی طرح اس حقیقت سے کبھی آنکھیں نہ چرا سکیں کہ جس منزل کی تلاش میں قافلے چلے تھے۔ وہ منزل انہیں کہیں مل نہ سکی تھی۔

بقول ناصر کاظمی:

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

یا بقول فیض احمد فیض:

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جس دور میں فرخندہ لودھی نے لکھنا شروع کیا وہ علامتی افسانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ علامت پرستی کے اس مقبول عام رجحان کے باوجود فرخندہ لودھی نے کہانی پن سے اپنا رشتہ برقرار رکھا اور اپنے فنی سفر میں محنت اور

مہارت کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں یہاں تک کہ اپنی الگ شناخت میں کامیاب رہیں۔ فرخندہ لودھی نے اپنے مجموعے کا عنوان ''رومان کی موت'' رکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بدلتا ہوا انسانی معاشرہ ایک لحاظ سے رومان کی موت ہی ہے۔ فرخندہ لودھی نے اپنے معاشرے کے تجربات کو تاریخ اور تہذیب کی کھٹالی میں ڈال کر جذبے کی آنچ پر پکایا ہے اور یوں ان کی کہانیوں کی تاثیر بڑھ گئی ہے۔ اپنے مجموعے کے دیباچے میں وہ لکھتی ہیں:

> ''......اسلام کے پاس انسانی فطرت کے مطابق لچک دار حلقہ تھا۔ اس نے برصغیر کے عوام کو اپنے اندر سمو لیا۔ رفتہ رفتہ، سیاسی، معاشی اور طبقاتی تبدیلیوں نے اس کی لچک میں سختی پیدا کر دی، انسانی عقل کی محدودیت کے سبب استحصالی ہتھکنڈے، مادی طاقتوری کے لئے جوڑ توڑ، انفرادی مفادات کی دوڑ اور ذاتی بقا کے لئے دوسروں کو بے وقوف بنانے کے سلسلے عود کر آئے اور ذہن رسا کی تھکا دینے والی حد تک پہنچ کر برصغیر کا گنگا جمنی معاشرہ ایک بار پھر نظریاتی گھیروں کو تنگ کرنے لگا۔ وسیع تر انسانی برادری کا آئیڈیل، جس کی فضا بننے لگی تھی حاصل ہونے کی بجائے معدوم ہو گیا۔''(۱۷)

فرخندہ لودھی کے افسانے اس طرز احساس کے عکاس ہیں کہ جب انسانی معاشرے میں برداشت کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور سماج دوسروں کو رعایت دینے کا رواج قائم نہیں رہنے دیتا۔ جب علیحدگی کا عمل ناگزیر ہو جاتا ہے اور نظریاتی دائروں کے اندر مزید نظریاتی دائرے بننے لگتے ہیں۔ جب سرحدیں قائم ہوتی ہیں اور ان کی حفاظت اور پھیلاؤ کے لئے اسلحے کے انبار لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ جب عوام کی حیثیت تشنج زدہ جذباتی ریوڑ سے زیادہ کی نہیں رہتی اور محنت اور ایمانداری کا بھاؤ بازار میں گرنے لگتا ہے تو فرخندہ لودھی کی کہانیاں جنم لیتی ہیں:

> ''......اور جب انسان کو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے تو وہ اپنی زندگی کا منصوبہ خود بناتا ہے۔ زمین و آسمان کے درمیان اپنی حیثیت کا تعین محتاط طریقے سے کرتا ہے۔ محبت کا مدہوش کن کھیل خرد مندی اور شعور کے ساتھ کھیلتا ہے۔''(۱۸)

فرخندہ لودھی کا افسانہ ''بوٹیاں'' منی کی کہانی سے شروع ہوتا ہے۔ منی جس نے پاکستان بنتے ہوئے قتل و غارت کے مناظر دیکھتے تھے۔ اپنے خاندان سے بچھڑ جانے کے بعد وہ غفوراں کے کوٹھے کی زینت بنی تھی اور اب پاکستان بن جانے کے بیس اکیس برس کے بعد ایک دفعہ پھر اسی قتل و غارت کو نئے نام سے ہوتا دیکھ کر اپنے گاہک سے پوچھتی ہے:

> ''اس وقت لوگ آزادی مانگتے تھے۔ اب کیا چاہتے ہیں۔ اب۔ اب۔ منی! یہ جو اپنا پاکستان ہے نا...... جان لے یہ وہی تمہارا کٹا ہوا اونٹ ہے...... ہر آدمی اپنی اپنی چھری پکڑے اپنا اپنا تھیلا

> بھر رہا ہے...... اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں چورا ہے میں پڑا ہوں اور لوگ میری بوٹیاں نوچ رہے ہیں...... وہ کوٹھا سی لاش میں ہوں۔‘‘
>
> ’’نہیں...... وہ تو میں ہوں۔ منی نے بمشکل اتنا کہا۔‘‘(۱۹)

۱۹۴۷ء کے بعد مہاجر کیمپوں کی حالت زار پر فرخندہ لودھی نے بہت اچھا افسانہ ’’رات کی بانہوں میں‘‘ لکھا ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس دیکھئے:

> ’’...... ورنہ کیمپ میں بہت گڑ بڑ تھی۔ منتظمین اپنی نیتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ کفن کے لئے لائے گئے کورے لٹھے کے تھانوں سے بھرے ٹرک ایک طرف سے کیمپ میں داخل ہوتے اور بھرے بھرائے دوسری طرف نکل جاتے۔ برف کی سلوں سے لدی ٹرالیاں داخل ہوتی نظر آتیں، پھر نہ معلوم کہاں بہہ جاتیں...... انچارج کلرک نے اسے بتایا کہ صبح سے کئی لوگ آئے اور دیکھ بھال کر اچھے تندرست بچے چن چن کر لے گئے...... زیادہ تر کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ ان مہاجر بچوں کو گھریلو ملازم کے طور پر لے جا رہے ہیں میڈم! اور کیا...... مفت کے غلام۔‘‘(۲۰)

انسان اپنی فطرت میں سنگدل ہے اور ظالم بھی۔ اس حقیقت کی عکاس یہ کہانی دل کے تاروں کو چھو لیتی ہے۔ فرخندہ لودھی نے مہاجر کیمپوں میں ہونے والے زیادتیوں اور انسان کے گھٹیا پن کا نہایت سفا کی مگر ماہرانہ چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد کی پوری فضا اس کہانی میں سمٹ آئی ہے۔ یہ کہانی اس لئے بھی پر تاثر ہے کہ یہ فسادات کے فوری ردعمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اس جذباتی بحران کے بعد، تھمی ہوئی کیفیت میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے افسانہ نگار نے اس صورتِ حال کا نہایت جزئیات کے ساتھ، غیر جذباتی تجزیہ کیا ہے۔ فرخندہ لودھی نے کمال مہارت کے ساتھ ۱۹۴۷ء سے شروع ہونے والی کہانی کا سلسلہ ۱۹۷۱ء سے جوڑا ہے۔ صغریٰ اور حامد کی کہانی، دو یتیم بچوں ہی کی کہانی نہیں بلکہ یہ نئے معاشرے میں خاندان کے عروج و زوال کی کہانی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کتنے ہی ایسے تھے کہ موری کی اینٹ تھے لیکن چوبارے جا لگے اور بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ اچھے بھلے آسمان کا تارا تھے لیکن زمین میں رل کر رہ گئے۔ مندرجہ بالا افسانہ وقت کے ایسے الٹ پھیر سناتا ہے۔ فرخندہ لودھی کا ایک اور افسانہ ’’آخری موم بتی‘‘ نچلے متوسط طبقے پر لکھا گیا ہے۔ نچلے متوسط طبقے کی حالتِ زار پر، فرخندہ لودھی کا عمدہ تبصرہ دیکھئے:

> ’’...... قبیل دار آدمی ہوں، سفید پوش کہلاتا ہوں۔ اس طبقے کے آدمی کو دھرم اور بھرم دونوں کھینچے رکھتے تھے اور وہ ان دونوں طنابوں میں خوب کسا تنا رہتا ہے۔‘‘(۲۱)

فرخندہ لودھی کا افسانہ ’’اتر کاٹو، میں چڑھوں‘‘ عصری سیاسی صورتِ حال پر گہرا طنز ہے:

> ’’...... دیکھا جائے تو دودھ کی نہریں محلوں کے لئے کھودی جاتی ہیں نہ کہ پبلک کے لئے۔ پبلک بھی پاگل ہے وہ ہاں میں ہاں ملا کر اپنی میٹی یا باری کے خواب دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی جمہوریت کے نام پر اور کبھی انصاف کے تقاضوں کے نام پر...... ہر وقت جمہوریت جمہوریت کی رٹ نہ لگایا کر۔ یہ پھکڑ پن کا نام ہے......۔‘‘ (۲۲)

اردو افسانہ نگاری کے ہر دور میں خواتین نے قابل قدر کردار نبھایا ہے اور اب بھی افسانے کی روایت کو مستحکم کر رہی ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں میں خواتین کی تعداد میں نمایاں اضافہ نظر آ رہا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ خواتین افسانہ نگار سماجی زندگی کی ناہمواریوں اور پیچیدگیوں پر مزید توانائی سے لکھتی رہیں گی۔

حواشی:

۱۔ حمیرا اشفاق، جدید اردو فکشن (لاہور: سانجھ، اکتوبر ۲۰۱۰ء)، ص ۱۴۸۔
۲۔ کرشن گولڈ، ’’میں کرکٹر بننا چاہتا تھا‘‘، مشمولہ، باتیں فیض سے مرتبہ شیما مجید (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۴۵۔۴۴۔
۳۔ حمیرا اشفاق، جدید اردو فکشن، ص ۱۶۰۔
۴۔ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور واجدہ تبسم کے افسانوں کا تفصیلی محاکمہ دیکھنے کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ صائمہ ارم ’’اردو افسانے میں شہری زندگی کے مسائل‘‘ (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جی سی یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء)
۵۔ ممتاز شیریں، ’’رانی‘‘، مشمولہ، اپنی نگریا (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۵ء)، ص ۱۱۶۔
۶۔ عمر میمن، محمد، تاریک گلی (لاہور: آر۔ آر۔ پرنٹرز ۱۹۸۹ء)، ص ۵۔
۷۔ جیلانی بانو، ’’راستہ بند ہے‘‘، سہ ماہی نیا ورق، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۳۰ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء): ص ۱۱۔
۸۔ ارتضیٰ کریم، ’’پانچ خواتین افسانہ نگار، اردو افسانے کا روشن منظر نامہ‘‘، سہ ماہی نیا ورق ایضاً، ص ۵۶۔۵۴۔
۹۔ بانو قدسیہ، ’’سوغات‘‘، مشمولہ امر بیل (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۲۔
۱۰۔ بانو قدسیہ، ’’ناخواندہ‘‘، مشمولہ توجہ کی طالب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۹۲۔
۱۱۔ بانو قدسیہ، ’’کاغذی ہے پیرہن‘‘، مشمولہ، توجہ کی طالب، ص ۳۲۴۔

۱۲۔ فہمیدہ ریاض، ''دفتر میں ایک دن''، مشمولہ، The Annual of Urdu Studies، شمارہ نمبر ۲۵ (۲۰۱۰ء): ص ۳۴۸۔

۱۳۔ The Annual of Urdu Studies، جلد ۱۵، ۲۰۰۰ء، آئن لائن ایشو

۱۴۔ ذکیہ مشہدی، پارسا بی بی کا بگھار (کراچی: سٹی پریس، ۲۰۱۶ء)

۱۵۔ ذکیہ مشہدی، ''ہدوکا ہاتھی''، مشمولہ آج، کتابی سلسلہ نمبر ٦۸ (اکتوبر ۲۰۱۰ء): ص ۲۱۔

۱٦۔ انتظار حسین، دیباچہ، رومان کی موت، فرخندہ لودھی (لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۔

۱۷۔ فرخندہ لودھی، رومان کی موت، ص ۱۹۔

۱۸۔ فرخندہ لودھی، رومان کی موت، ص ۲۳۔

۱۹۔ فرخندہ لودھی، ''بوٹیاں''، مشمولہ، رومان کی موت، ص ۱۰۲۔

۲۰۔ فرخندہ لودھی، ''رات کی بانہوں'' میں، ص ۱۱٦۔ ۱۱۵۔

۲۱۔ فرخندہ لودھی، ''آخری موم بتی''، ص ۱۵۵۔

۲۲۔ فرخندہ لودھی، اتر کاٹو، ''میں چڑھوں''، ص ۱۸۲۔

ماخذ

ارتضیٰ کریم، ''پانچ خواتین افسانہ نگار، اردو افسانے کا روشن منظر نامہ''، سہ ماہی نیا ورق (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء)۔

بانو قدسیہ۔ امر بیل۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

بانو قدسیہ۔ توجہ کی طالب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء۔

جیلانی بانو۔ ''راستہ بند ہے''، سہ ماہی نیا ورق، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۳۰ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء)

حمیرا اشفاق۔ جدید اردو فکشن۔ لاہور: سانجھ، ۲۰۱۰ء۔

ذکیہ مشہدی، ''ہدوکا ہاتھی''، مشمولہ آج، کتابی سلسلہ نمبر ٦۸ (اکتوبر ۲۰۱۰ء)۔

ذکیہ مشہدی۔ پارسا بی بی کا بگھار۔ کراچی: سٹی پریس، ۲۰۱٦ء۔

صائمہ ارم۔ ''اردو افسانے میں شہری زندگی کے مسائل''۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جی سی یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء۔

عمر میمن، محمد۔ تاریک گلی۔ لاہور: آر۔ آر۔ پرنٹرز ۱۹۸۹ء۔

فرخندہ لودھی۔ رومان کی موت۔ لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۲ء۔

فہمیدہ ریاض، ''دفتر میں ایک دن''، مشمولہ، The Annual of Urdu Studies، شمارہ نمبر ۲۵

(۲۰۱۰ء)۔

کرشن گولڈ۔ ''میں کرکٹر بننا چاہتا تھا''، مشمولہ، باتیں فیض سے، مرتبہ شیما مجید۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔

ممتاز شیریں۔ اپنی نگریا۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۵ء۔

The Annual of Urdu Studies، جلد ۱۵، ۲۰۰۰ء، urdustudies.com